سرسیّد کا تصورِ تاریخ

پروفیسر آفتاب احمد آفاقی

تاریخ بہ ظاہر ماضی کے واقعات کی روداد ہے، مگر اس کی حیثیت ماضی اور حال کے مابین ایک مسلسل جاری رہنے والے مکالمے کی ہے اور یہ اپنی اصل صورت میں تاریخ نگار اور واقعات کے باہمی اثر پذیری کے نتیجے میں بہ روئے کار آتی ہے۔ اس اعتبار سے تاریخ نویسی واقعات کو ان کے اصل شکل میں دیکھنے اور ان کے محرکات اور حقیقی بنیادوں کا پتا لگانے نیز ان کی صحت مندانہ انداز میں تعبیر و ترجمانی کا عمل قرار دی جاسکتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تاریخ کا مطالعہ، زندگی کا نسبتاً جامع اور متحرک شعور عطا کرنے اور حقائق کی نئی پہچان اور پرکھ کا باعث ہوتا ہے۔ یہ ماضی کے عرفان کے ساتھ حال اور مستقبل کا زیادہ بہتر شعور عطا کرتا ہے۔ تاریخ محض ماضی کے واقعات یا حالات کی کھتونی نہیں بلکہ معاشرتی اور تہذیبی اقدار کے تقابل کی ایک راہ ہے۔ مشہور ڈچ عالم Huzinga تاریخ کو Teleology سے تعبیر کرتا ہے۔ کائنات کے تمام تغیرات کے پیچھے کوئی نہ کوئی غایت یا مقصد چھپا ہوا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ تاریخ داں محض ''کیوں'' پر اصرار نہیں کرتا بلکہ وہ ''کدھر'' کی بھی تلاش کرتا ہے۔ وہ تاریخ کو ایک خاص مفہوم میں تسلسل اور ارتقا سے تعبیر کرتا ہے۔ جب ہم ماضی سے بے گانگی کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور مستقبل سے وابستہ ممکنہ

ترقیات کو فراموش کر دیتے ہیں تو مؤرخ بھولا ہوا سبق یاد دلاتا ہے اور زمانے کی بڑھتی ہوئی رو، اور اس کے ارتقائی رخ اور رفتار کی طرف راغب کرتا اور انقلابی شعور سے باخبر کرتا ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ ہم جسے حال یا لمحۂ حاضر کہتے ہیں وہ فرضی خط فاصل Imaginary dividing line ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل کے رشتے اتنے مربوط اور پائیدار ہیں کہ انہیں قطعاً ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا، کہہ سکتے ہیں کہ ماضی کے واقعات، حالات اور سانحات ایک ایسی دستاویز مرتب کرتے ہیں جن کی روشنی میں مستقبل کے بہتر امکان کا یقین ممکن ہے۔

سرسید کی تاریخی بصیرت اور کارناموں، ان کے افکار و خیالات کو تاریخ کے اسی وسیع تصور اور مفہوم کی بنیاد پر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں سرسیّد کے یہ الفاظ ان کے فکر کو واضح طور پر سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں:

> ''جب اپنے ہم وطنوں کے حال پر غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ گذشتہ حالات سے اس قدر ناواقف ہیں کہ آئندہ رستہ چلنے کو ان کے پاس کچھ بھی نہیں، وہ جانتے کہ کل کیا تھا اور آج کیا ہے، اور اس سبب سے وہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کل کیا ہوگا۔''[1]

اس اقتباس سے یہ اشارہ بدیہی طور پر ملتا ہے کہ وہ حال کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے کے لیے ماضی کا جائزہ لینا ضروری تصور کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ تاریخ نگار عصبیت سے پوری طرح پاک نہیں ہوتا اسکے ہر دعوے میں ایک مخصوص تصور، عقیدے اور مقصد کی کارفرمائی ضروری ہوتی ہے۔

سرسیّد کی تاریخ نگاری بھی ایک مخصوص تصور اور مقصد کے تابع ہے۔ جس کی نمائندگی صرف ان کی تاریخی کتابوں سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی جھلک ان کی مذہبی، ادبی اور صحافتی تحریروں میں بھی نظر آتی ہے، یہ اور بات ہے کہ ان کی تعقل پسندی، مدعا نویسی اور

سائنسی توجیہات انہیں اس باب میں اپنے پیش روؤں اور معاصرین پر بین تفوق عطا کرتی ہے۔

سر سیّد کی تاریخی بصیرت اور شعور کا یہ بے حد اہم پہلو ہے جو علی گڑھ تحریک، سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق کے پسِ پردہ واضح طور پر کارفرما ہے، جو ان کی ہمہ گیر علمی، تعلیمی، مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور ادبی خدمات کے طاقتور محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ان کے اسی تاریخی اور عقلی تصور اور شعور کا نتیجہ تھا کہ ان کے اندر قومی اور تہذیبی سرمائے کی حفاظت اور اس کے ایک ایک نقش کو محفوظ کر کے آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ سر سید ماضی کو محض نقش کہن سمجھ کر نظر انداز کرنا درست تصور نہیں کرتے بلکہ حال اور مستقبل سے ناگزیر رشتے کا واضح احساس رکھتے ہیں۔ سر سیّد کے جملہ کارناموں میں یہی تصور کارفرما ہے اور جو ان کی تاریخی بصیرت کی حقیقت اور قدر و قیمت کو سمجھنے میں معاون ہوتا ہے۔

سر سیّد کا دور جو انیسویں صدی کے نصف آخر پر مشتمل ہے، فکری و تہذیبی سطح پر شکست و ریخت کا دور رہا ہے۔ انگریزوں کے تسلط اور جبر سے عوامی زندگی میں بے یقینی پیدا ہو چکی تھی۔ عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے مذہبی مباحثوں کے دروازے کھل گئے تھے۔ اسی دوران مناظرہ بازی اور مذہبی مدافعت کا رجحان بھی پیدا ہوا دراصل اس صدی کے نصف اوّل ہی سے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں مذہب کے متعلق نئی جستجو اور چھان بین کی ابتدا ہو چکی تھی، اس ضمن میں شاہ ولی اللہ اور سیّد احمد بریلوی کی احیائی تحریکات کے ساتھ سوامی دیا نند سرسوتی کی آریہ سماجی تحریک جو اصلاً ویدک مذہب کی احیا کے لیے وجود میں آئی۔ یہاں راجہ رام موہن رائے کی ریڈیکل تنظیم برہمو سماج کا حوالہ دینا خصوصیت کے ساتھ ضروری ہے جس نے حقیقت تک رسائی اور اس کے ادراک کے لیے سب سے بڑا ذریعہ اور معیار ''عقل'' کو قرار دیا تھا۔ یہ واضح رہے کہ انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات نے اس رجحان کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا

۔مغربی علوم اور افکار وخیالات ہمارے ذہن وفکر و معاشرت وتہذیب پر نمایاں اثرات مرتب کیے۔ سرسیّد اور ان کے نامور رفقاء نے اس بدلتی صورت میں قوم کی ذہنی وفکری تربیت کی ایک نئی راہ دکھائی۔ ان کی قیادت میں علی گڈھ تحریک نے انیسویں صدی کے تیزی سے بدلتے ہوئے ہندستان میں، جب کے تہذیب وتعلیم کے تقاضوں کو سمجھنا ناگزیر ہوگیا تھا، مغربی علوم وافکار سے چشم پوشی، مزید نقصانات کی باعث ہوسکتی تھی۔ اس ضمن میں شعروادب اور تاریخ وصحافت کے کردار کی بھی خاص اہمیت ہے۔ جس کے بغیر سرسیّد کے وسیع تر قومی اغراض اور اصلاحی مقاصد پر مبنی کوششیں بارآور نہیں ہوسکتی تھیں۔ سرسیّد کی ادبی وعلمی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ تاریخ، سیاست، آثار قدیمہ، صحافت، ادب، مذہب اور سائنس وغیرہ سب ہی اس میں شامل ہیں۔

سرسیّد کو تاریخ سے دلچسپی وراثت میں ملی تھی۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز ۱۸۴۸ء میں آثار الصنادید سے ہوا، جس کا امتیاز ان کی تاریخی تصانیف میں مسلم ہے۔ جسے صحیح معنوں میں ان کی گہری سوچ اور بصیرت، ان کے ماضی کی صالح قدروں سے وابستگی اور تحفظ کے جذبے اور اپنے اسلاف کے کارناموں کو نئی نسلوں میں منتقل کرنے کے جذبے کا نام دینا درست ہوگا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ عہد قدیم کی تاریخ کو ممتاز مؤرخ رومیلا تھاپر ''ہندستان میں نئی ترقی کے عہد سے تعبیر کرتی اور فنِ تعمیر اور تنظیمی صلاحیتوں کا اعلیٰ نمونہ قرار دیتی ہیں اور مسلمانوں کے فنی شعور، ان کے ذوقِ جمال، جاہ وحشمت، تہذیب وتمدن اور ترقیات کی کھلی ہوئی شہادت بتاتی ہیں۔ اس پس منظر میں ''آثار الصنادید'' کے مطالعے سے مسلمانانِ ہند کی عظمتِ گزشتہ کی شاندار اور عزت انگیز تصویر سامنے آتی ہے۔

کتاب ہٰذا کے تین ابواب میں دہلی کی عمارتوں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور آخری باب میں دہلی کے ۱۲۰/مشاہیر جن میں علماء صوفیا، اطبا، موسیقی دانوں اور دوسرے فنون کا مختصر مگر جامع تذکرہ ہے۔ بقول سرسیّد:

''یہ وہ یادگار ہیں جو ہمارے بزرگوں نے بنائی تھیں جن سے ان کی

شان و شوکت ظاہر ہوتی تھی، مگر اس زمانے میں وہ سب افسوس اور
حسرت کی نگاہوں سے دیکھنے کے لائق ہیں کہ ہم ایسے ناخلف
ہوئے کہ ان کو قائم نہ رکھ سکے اور مٹا دیا۔ مجھے امید ہے کہ مسلمان
اپنے بزرگوں کے ان ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کو دیکھیں گے اور
روئیں گے کہ دارالسلطنت میں جہاں سالہا سال مسلمانوں نے
بادشاہی کی وہاں مسلمان کے پاس حسرت اور افسوس کے سوا کچھ
باقی نہیں۔''۲

کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ تاریخی یادگاریں ہمارے بزرگوں کی وہ نشانیاں ہیں جن میں ان کی جدّ و جہد، جانفشانی اور ان کے بلند حوصلے کی داستانیں پوشیدہ ہیں اور ہر زمانے میں ہمیں جہد و عمل کی دعوت دیتی رہیں گی۔ یہ ہمارے تاریخی اور ثقافتی ورثے کا حکم رکھتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سر سیّد قدیم ہندستان کے تہذیبی اور آثاری سرمایا کو بزرگوں کی کمائی تصور کرتے تھے، بقول سر سیّد:

''کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی
تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھودے۔''۳

سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں آثار قدیمہ کی اہمیت کو سب سے پہلے سر سیّد نے محسوس کیا اور اس پر باقاعدہ تحقیق کی بنیاد ڈالی۔ ان معنوں میں وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے آثار قدیمہ کے موضوع پر علمی اور محققانہ انداز پر کتاب لکھی اور تحقیق کے سلسلے میں انگلستان کا باضابطہ سفر کیا۔ علاوہ ازایں انھوں نے فارسی مآخذ تاریخ کو ایڈٹ کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی، ابوالفضل اور جہانگیر کی تزک کی ترتیب و تدوین ان کے تاریخی شغف کا پتا دیتی ہیں۔ جام جم اور سلسلۃ الملوک گو صرف تالیفات میں شمار کی جائیں
گی لیکن ان کی ترتیب میں انہیں خاصی محنت کرنی پڑی۔ جامِ جم تیموری سلسلہ سے متعلق

معلومات پر مشتمل ہے جبکہ سلسلۃ الملوک میں دہلی کے ان سارے بادشاہوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئیں ہیں جن کا تاریخ میں تذکرہ ہے۔

'آثارالصنادید' کے بعد تاریخ کے میدان میں سرسیّد کا زبردست کار''نامہ تاریخ فیروزشاہی، آئین اکبری اور تزک جہانگیری کی تدوین ہے، انھوں نے آئینِ اکبری کا ایک ایڈیشن نہایت اہتمام سے نکالا جس میں مغل زیورات کی تصویریں، خیمہ گاہ، بادشاہی اور تمام پھل دار اور پھول دار درختوں کی تصویریں شامل ہیں، تاریخ فیروز شاہی ایسیا ٹک سوسائٹی بنگال کے زیر اہتمام ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی اشاعت کے بعد سے اب تک عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے سیکڑوں محققین نے اس سے استفادہ کیا ہے۔''[۴]

آئین اکبری کے متن کی تصحیح، اس کے مشکل مقامات کی وضاحت، عربی و فارسی، ترکی اور سنسکرت کے نامانوس اصطلاحوں کی تشریح اور بے شمار تصویروں کا اضافہ فنِ تاریخ سے سرسیّد کی غیر معمولی دلچسپی کا آئینہ دار ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سرسیّد کا تاریخی اور سیاسی شعور زیادہ پختہ اور بالیدہ ہو کر سامنے آتا ہے، اس کی متعدد وجہیں بتائی گئیں ہیں۔ احتشام حسین کے الفاظ میں:

> ''سرسیّد نے مغل حکومت کے چراغ بجھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، مسلمانوں کی بدحالی اور زوال کا نظارہ کیا تھا، زمانے کی بدنظمی اور بدامنی کا مشاہدہ کیا تھا۔ غدر نے جس طرح رہی سہی آن بھی ختم کر دی تھی اس نے ان کے قلب کو بے حد متاثر کیا اور ان میں جو علمی صلاحیتیں سو رہی تھیں وہ جاگ اٹھیں۔''[۵]

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسیّد اس وقت میں سب سے زیادہ جری، باعمل، دوربین اور عقل پرست تھے، انھوں نے شدت سے محسوس کیا کہ انگریزوں کے سیاسی تسلط کو روکنا یا چیلنج کرنا آسان نہیں ہے۔ سو غدر کے نازک پہلوؤں پر اپنا رسالہ ''اسباب

بغاوتِ ہند'' لکھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں داخل ہونے کی یہ ان کی پہلی شعوری کوشش تھی۔ ہر چند کہ وہ سرکاری ملازم تھے لیکن انھوں نے انگریزی حکومت کی چیرہ دستیوں کو بھی بے نقاب کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ چونکہ انگریزوں نے بھی ہندستانیوں پر بھروسہ نہیں کیا اس لیے وہ ان برکتوں سے حقیقتاً فائدہ نہ اٹھا سکے جو انگریزی حکومت اپنے ساتھ لائی تھی۔ انہوں نے ساری قوت اس پر صرف کر دی کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں قربت اور دوستی قائم ہو جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانیوں کی قومی، سیاسی، تہذیبی، سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے حاکم و محکوم کے درمیان حائل منافرت ختم کر کے مصالحت کی صورت پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ حکمراں قوم کی ترقی کے رازوں کا سراغ لگا کر، ان وسائل اور ذرائع کو اپنا کر ترقی کے مسدود دروازوں کو کھولا جا سکے، بالخصوص مسلمانوں میں وہ عقل اور فہم و فراست کی بنیاد پر ایک نئے نظامِ حیات کی تعمیر کرنا چاہتے تھے جسے بعض ناقدین اسے انگریزی حکومت اور اپنی قوم مسلمان سے وفاداری قرار دیتے ہیں۔ ۶ اور اس سے یہ نتیجہ برآمد کرتے ہیں کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قوم سمجھتے تھے، مگر اصلیت یہ کہ انہوں نے خالص قومی مفاد کے پیشِ نظر یہ رویّہ اختیار کیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے عتاب کا شکار زیادہ تر مسلمان ہوئے تھے جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی، جواہر لال نہرو کا خیال ہے:

''مسلمان مقابلتہً ذرا زیادہ جارح اور لڑاکو سمجھے جاتے تھے، لہٰذا برطانوی حکومت نے مسلمان کو زیادہ سختی سے دبایا۔'' ۷

سر سیّد نے بیک وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے آواز بلند کرنے کے بجائے محض مسلمانوں کے حقوق کو پیشِ نظر رکھا بھی تھا تو اس کے پس پردہ انگریزوں کی سیاسی شعبدہ بازی کا بھی کچھ نہ کچھ دخل تھا۔ اس سلسلے میں امبیکا چرن مجمدار اپنی کتاب Indian National Evalution میں لکھتے ہیں کہ:

''اوّل اوّل انگریزی عملداری کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کے

مقابلے میں ہندوؤں کو بڑھایا گیا اور اس کے بعد ہندوؤں کے
مقابلے میں مسلمانوں کو اٹھایا گیا جو باہمی رنجش اور عداوت کا موجب
ہوا۔''

جیمس او کیلی 'کلکتہ ریویو' میں لکھتے ہیں:

''ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی بے اطمینانی بے بنیاد تھی۔ سالہا سال سے مسلمان کو نظر انداز کیا جا رہا ہے یا انہیں ایسی رعایا سمجھا جا رہا ہے جن کی اطاعت مشتبہ ہے۔ ان کی تعلیم کی طرف سے غفلت کی جا رہی ہے۔ حتیٰ کے ان کے اوقاف کی آمدنیوں کو جو اسلامیہ کالجوں کے قیام کے لیے تھیں دوسرے کاموں میں صرف کیا جا رہا ہے۔''[۸]

سرسیّد کے سیاسی زندگی میں تعصب یا تنگ نظری کو دخل نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں غیر متوازن صورتِ حال کی وجہ سے مذہبی اختلافات کے جراثیم پرورش پا رہے تھے۔ سرسیّد پر اس طرح کا الزام لگانے سے قبل ان کے نقطۂ نظر میں آئے تبدیلی کے محرکات کا پتا لگانا چاہئے، جس کے چشم دید گواہ مولانا الطاف حسین حالؔی اپنی کتاب ''حیات جاوید'' میں بڑی تفصیل سے تحریر فرمائی ہے۔

یہاں ''تاریخ سرکشی بجنور'' کا تذکرہ بھی ضروری ہے جس میں مئی ر۱۸۵۷ء سے اپریل ر۱۸۵۷ء تک ضلع بجنور میں واقع غدر کے حالات درج ہیں۔ اس زمانے میں سرسیّد ایسٹ انڈیا کمپنی کے صدر امین کی حیثیت سے ملازمت کر رہے تھے۔ اس تاریخی تصنیف کے محرکات پر سرسیّد نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ ممکن ہے کہ اس کا مقصد جذبہ تاریخ نگاری کو آسودہ کرنا ہی رہا ہو، لیکن دورانِ بغاوت اپنی خدمات کو اجاگر کرنے کی خواہش بھی شاید ان کے تحت الشعور میں پوشیدہ رہی ہوگی۔ کتاب کے دیباچے میں سرسیّد نے دعویٰ کیا ہے کہ اس تاریخ میں جو کچھ لکھا ہے وہ نہایت صحیح اور سچ ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سرسیّد بغاوت کے اسباب کو پوری طرح اجاگر نہ کر سکے۔ مشتِ نمونہ از خروارے کے مصداق یہ

اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ ہنگامہ وفساد جو پیش آیا، صرف ہندوستانیوں کی ناشکری کا وبال تھا.....اگر تم پچھلی عمل داریوں کے ظلم اور زیادتی سے واقف ہوتے تو سرکارِ انگلشیہ کی عملداری کی قدر جانتے اور خدا کا شکر ادا کرتے۔ مگر تم نے کبھی خدا کا شکر ادا نہیں کیا اور ہمیشہ ناشکری کرتے رہے، اس لیے خدا نے اس ناشکری کا وبال ہم ہندوستانیوں پر ڈالا ہے۔''۹

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کی وفاداری اور خدمات کے صلے میں ملنے والی ملکیت اور ایک لاکھ روپئے کو سر سیّد نے ٹھکرا دیا تھا، اور قوم کی تباہی و بربادی کو دیکھ کر ہندوستان میں رہنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی ان کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوا:

''نہایت نامردی اور بے مروتی ہے کہ میں اپنی قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر خود کسی گوشہ عافیت میں جا بیٹھوں، نہیں! اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہئے، اور جو مصیبت پڑی ہے اس کے دور کرنے میں کمر ہمت سے باندھی جائے۔ میں نے ارادہ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔''۱۰

واقعہ یہ ہے کہ سر سیّد نے ایسے پر آشوب دور میں نہایت حوصلے کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا۔ انہیں یہ احساس تھا کہ ہندستانیوں میں جذبات و احساسات کے باوجود عمل کی حلاوت یا گرمی نہیں جو یورپ کی زندگی کا خاصہّ ہے۔ لہٰذا انہوں نے عمل پر خصوصی توجہ دی۔ ماضی پرستی کے بجائے حال کو استوار کرنے اور مستقبل کو سوارنے کی تدبیر میں لگ گئے۔ انہوں نے ضروری سمجھا کہ قدیم تہذیبی نظام کا از سر

ِ نو جائزہ لیا جائے اور اسے مغرب کے مادی و عقلی تصورات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ بنیادی طور پر حکومت سے عدم تعاون کی پالیسی، تقلید پرستی، مذموم رسم رواج کی پابندی، قومی تعصّبات کی جکڑ بندی اور جدید تعلیم و تربیت کی کمی مسلمانوں کو تباہی و بربادی کی طرف لے

جا رہی تھی۔ سرسید کی یہ فکر ان کے نظریۂ تاریخ میں تعمیر کا باعث بنی۔ تاہم ان کے مقصد میں کبھی کوئی فرق واقع نہ ہوا۔ انہوں نے جس علمی اور تحقیقی شوق کے تحت 'آثار الصنادید' مرتب کی تھی اس نے ہی تاریخ نویسی کو ایک واضح مقصد کے تابع کر دیا۔

المامون (شبلی) کی اشاعت ثانی کے وقت ان کا خیال تھا کہ تاریخ کو ''احیائے قومی کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے'' مگر انہوں نے یہ ضروری سمجھا کہ ''بزرگوں کے قابل یادگار کاموں کو یاد رکھنا اچھا اور برا دونوں پھل دیتا ہے۔ تاریخ کے برے پھل سے مراد ہے کہ لوگ اسلاف کی عظمت پر قانع ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور خود کچھ نہیں کرتے۔ اس لیے ماضی میں یوں محصور رہنا برا پھل ہے۔'' ان کا یہ خیال ان کی روایت شکنی پر دلالت کا درجہ رکھتا ہے۔ اتنا ہی نہیں سرسید کے خیالات میں بعد میں مزید توسیع بھی ہوئی اور تبدیلی بھی آئی۔ وہ علمی ضرورتوں اور جدید اجتماعی مسائل کو پیش از پیش اہمیت دینے لگے تھے کہ انہوں نے ایک مرتبہ ایک خط میں یہاں تک لکھ دیا کہ ''ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا کرے مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں'' اس سلسلے میں ان کے اور نواب عماد الملک کے درمیان طویل خط و کتابت بھی ہوئی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کے نزدیک تاریخ کے بعض برے پھل ایسے بھی ہیں جو تعبیر جدید کے حق میں زہریلے ثابت ہو سکتے ہیں۔ سرسید دراصل تاریخ کو پیچھے مڑ کے دیکھنے کی بجائے آگے بڑھنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ تاریخ کے اپنے حدود اور مطالبے ہیں۔ روایات کی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن بقول سید عبداللہ وہ اس معاملے میں اتنے انتہا پسند ہوئے تھے کہ روایات کے تسلسل سے قومی زندگی کی جو تعمیر ممکن ہے اس سے بھی بے نیاز ہو گئے تھے۔ ۱۱ یہ بے نیازی ان کے غور و فکر کا نتیجہ تھی۔ وہ جدید علوم و فنون کی طرف مخلصانہ قدم بڑھانے اور حکومت وقت سے تعاون کا فیصلہ بزدلی یا ابن الوقتی کا ثبوت نہ تھا۔ ۱۲ بلکہ وقت کی نزاکت کے احساس کی کارفرمائی ہے۔ امداد صابری نے اپنی کتاب '۱۸۵۷ کے مجاہد شعرا' میں یہاں تک لکھا ہے کہ ''سرسید کو انگریز کی ہر ادا پسند تھی'' لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک مفروضہ محض ہے۔ اگر انہیں انگریزوں کی ہر ادا پسند ہوتی تو

شاید ان کے قلم سے 'خطبات احمدیہ' جیسی عظیم تصنیف وجود میں نہ آتی۔[۱۳] محسن الملک کے نام ایک خط میں انگریزوں کی لکھی ہوئی ہندوستان کی غلط اور تعصب بھری تاریخ کی مذمت میں ان کا قلم نہ اٹھتا۔ انہیں مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید مقصود ہوتی تو وہ اپنے مضمون میں ترکوں کے تہذیبی محاسن پر مغربی تہذیب سے مقابلہ کر کے ان کی خوبیوں اور مغربی تہذیب کی بعض برائیوں کی نشاندہی نہ کرتے۔[۱۴] سرسید کی ساری ذہنی تربیت مشرقی علوم کے ذریعے ہوئی تھی، وہ ان کے تحفظ کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے، لیکن بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی: ''وہ اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے تھے کہ Experimental Age نے علوم وفنون سے استفادے کے پیمانے بدل دیے ہیں، جہاں مسائل طبعی تجربے سے ثابت کیے جاتے ہیں۔''[۱۵] 'تہذیب الاخلاق' کے اجرا کا مقصد بھی سوئی ہوئی ذہنیت کو بیدار کرنا، ان کو رفتار زمانہ کے ساتھ چلنے کی ترغیب دینا اور ترقی کے اسباب کو دریافت کرنا ہی تھا۔ اس کا بین ثبوت 'تہذیب الاخلاق' کے پہلے شمارے کی یہ تحریریں ہیں:

> ''اس پرچے کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سوشلائیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تا کہ جس حقارت سے سوشلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلائیں۔''

سرسید نے یہاں تہذیب کو وضع کے مفہوم میں استعمال کیا ہے جو کسی قوم کے اجتماعی اطوار، رسم و رواج، مدنیّت اور کسی معاشرے کے نظام اقدار کو محیط ہے۔ یہاں روحانیت کے ساتھ مادیت اور دنیا کے ساتھ دین کے توزن کو برقرار رکھتے ہوئے قوم کو معزز و مہذب بنانے کا جذبہ موجود ہے۔ واضح رہے کہ تہذیب اور تاریخ کا رشتہ اٹوٹ ہے، تہذیب مظہر ہے معاشرتی شعور کے ارتقا کا، جس کے تحت ذہنی و عملی قوتوں کا اشتراک، تخلیق، ایجاد و اختراع کا ہر پہلو نمایاں ہوتا ہے، تہذیب کسی قوم یا فرد کا کلی و روحانی و معاشرتی ورثہ اور عقائد و افکار کے مجموعہ سے عبارت ہے[۱۶]، سچی بات تو یہ ہے کہ سرسید

مشرق ومغرب کی اعلیٰ روحانی اور مادی قدروں کو ہم آہنگ کر کہ ایک نئے تصورتہذیب کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے۔

بہرحال اردو تاریخ نگاری کی روایت میں سرسید کی حیثیت بنیاد گذار کی ہے۔ اس عہد کے دو بڑے مورخ یعنی شبلی اور ذکاءاللہ نے سرسید سے متاثر ہوکر تاریخی کتابیں لکھیں۔ سرسید نے پہلی مرتبہ پرانی تاریخ کو ازسرنو مرتب کرنے اور تاریخ کے جدید اصولوں پر تدوین اور مطالعہ جدید کی اہمیت پر توجہ دی۔ انھوں نے تاریخ کو اجتماعیت کی روشنی میں سمجھنے اور پیش کرنے کی اہمیت پر زور دیا، نیز شبلی کے اس طریقہ کار کی تحسین کی کہ واقعات تاریخ کے اسباب دریافت کیے جائیں گویا فلسفۂ تاریخ کی طرف مؤرخوں کی توجہ مبذول کرائی۔

شبلی کی المامون، الفاروق، النعمان، الغزالی وغیرہ سرسید کے پیدا کیے ہوئے جذبہ وذوق کی آئینہ دار ہیں۔ ذکاءاللہ کی تاریخ ہند کی ترتیب میں سرسید کی رہنمائی سے صرف نظر ممکن نہیں۔ سرسید اور شبلی کے تعمیری مقاصد میں یکسانیت کے باوجود دونوں کے تاریخی تصور اور دائرۂ کار میں نمایاں فرق ہے۔ یہ فرق دراصل دونوں کے Attitude کا ہے، سرسید اور شبلی دونوں تاریخ میں واقعیت کے اسباب پر توجہ دیتے ہیں، لیکن سرسید سوشل اور کلچرل تفصیلات، سیاسی زندگی کے علاوہ علمی اور ذہنی ترقیوں کے حال پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔ شبلی کے موضوعات تو اہم ہیں لیکن ان کی تاریخیں چند افراد اور مخصوص دور سے آگے نہیں بڑھیں، بقول سید عبداللہ، شبلی کی نظر تاریخ کے چند نمایاں ٹکڑوں اور حصوں پر پڑتی ہے یعنی ساری تصویر کی بجائے چند نقطے........تاریخ کے صرف انھی چند لفظوں کو ابھار دینا ان کا واحد نصب العین ہے۔[۷] شبلی کے ہیرو بھی برگزیدہ اور عظیم مذہبی شخصیتیں ہیں جہاں عقلیت کی بجائے عقیدت اور احساساتی عنصر غالب ہے۔ جب کہ سرسید کے موضوعات خالصتاً ہندوستانی ہیں۔ وہ تاریخ کو آئندہ نسلوں تک اپنے ملک اور قوم کے عروج اور زوال کے صحیح علم کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی بزرگوں سے

عقیدت ہے لیکن یہ عقیدت ان کی علمی، سیاسی، تہذیبی اور سماجی خدمات کے سبب ہے۔ سرسید کے فکر وعمل اور تاریخی تصور کو ۱۹ویں صدی کی سماجی اور سیاسی صورت حال، اسلامی اور مغربی فکر کی تاریخ نیز تشکیک اور بے یقینی کی سرحد پر کھڑے ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی کیفیت اور اس بے یقینی کے ماحول سے نجات دلانے کی ان کی کوشش کے تناظر میں دیکھنا چاہئے۔

☆☆☆